Fikr-o-Nasar (Islamabad) 17:5-6 (1979)

اقبال کی شاعری میں انسانی عظمت کا تصوّر

نظیر صدیقی

'نئی وجودیت' کے بانی کولن ولسن نے اپنی خیال انگیز تصنیف عہدِ شکست (THE AGE OF DEFEAT) میں جدید انسان کے اس بنیادی مرض کی تشخیص کی ہے جو آج کے مغربی ادب کے بیشتر حصے میں منعکس ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جدید انسان اس مرض میں مبتلا ہے جسے اپنی بے اہمیتی کا مغالطہ کہا جا سکتا ہے۔ یوجین او نیل، جیمس جوائس، ولیم فاکنر، ارنسٹ ہمنگوے، ٹینیسی ولیمز، آرتھر ملر، گراہم گرین، آلڈس ہکسلے، سیموئل بیکٹ، ژاں پال سارتر، البیر کامو وغیرہ جیسے ادیبوں کے گہرے تجربے نے اسے اس نتیجے تک پہنچایا کہ جدید انسان اپنی بے اہمیتی کے عام احساس میں مبتلا ہے۔ جدید فکشن کے تقریباً تمام ہیرو غیر اولوالعزم (UNHEROIC) شکست خوردہ مفلوج اور قنوطیت زدہ ہیں۔ زندگی کی لایعنیت یا زندگی کے بے معنی ہونے کا خیال جدید انسان کی روح میں اس حد تک اتر گیا ہے کہ وہ اپنے آپ کو ایک کیڑے سے زیادہ تصور نہیں کرتا۔ وجودیت نے یہ سوال اٹھایا تھا کہ انسان خدا ہے یا کیڑا؟ انسان کو جو ہمیشہ خدا بننے کا آرزومند رہا ہے اسے اب یقین ہو چلا ہے کہ وہ ایک کیڑے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔

جدید ادیبوں میں ایسے بہت کم ہیں جو زندگی کے بامعنی ہونے اور انسان کی لازمی یا امکانی عظمت کا اثبات کرتے ہیں۔ ایسے ادیبوں میں برنرڈ شو سب سے نمایاں حیثیت کا مالک ہے یہی وجہ ہے کہ کولن ولسن برنرڈ شو کا سب سے بڑا پرستار ہے۔

ولیم بلیک اور برنرڈ شو سے متعلق کولن ولسن کی مدح سرایانہ تحریریں پڑھنے کے بعد ہمارے دل کی گہرائیوں میں یہ آرزو انگڑائی لینے لگتی ہے کہ کاش کولن ولسن اقبال کی شاعری سے واقف ہوتا۔ ایک مرتبہ اقبال کی طرف اسے متوجہ کرنے کی کوشش بھی کی گئی لیکن محسوس یہ ہوا کہ وہ اپنی تصانیف کے معاملے میں اس درجہ مصروف

ہے کہ اسے اقبال جیسے مشرقی شاعر فلسفی سے دلچسپی لینے کی فرصت ہی نہیں۔

کسی کولن ولسن کو اقبال سے واقف ہونے کی فکر ہو یا نہیں اقبال کا کوئی قاری اس تاثر سے نہیں بچ سکتا کہ عہد حاضر میں انسان کی اہمیت اور عظمت کے سب سے مؤثر اثبات نے اقبال کی شاعری میں اظہار پایا ہے۔ اقبال نے آدم کی تخلیق کو جس پرشکوہ انداز میں بیان کیا ہے اس کی مثال عالمی شاعری میں شاید ہی مل سکے ؎

نعرہ زد عشق کہ خونیں جگرے پیدا شد
حسن لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شد
فطرت آشفت کہ از خاک جہان مجبور
خودگرے، خود شکنے، خود نگرے پیدا شد

انسانی عظمت کے تصور کا اس سے زیادہ پُر زور، پاکیزہ اور بلیغ اظہار اور کیا ہو سکتا ہے؟ ان شعروں کا سب سے زیادہ توجہ طلب پہلو یہ ہے کہ ان اشعار سے جو انسان برآمد ہوتا ہے وہ محض تخیل کی پیداوار نہیں۔ اس میں ایک تاریخی مخلوق کی تمام تر حقیقت موجود ہے۔ وہ فی الواقع ایک خونین جگر، صاحب نظر، خودگر، خود شکن اور خود نگر مخلوق ہے۔ اس میں بھی شک نہیں کہ وہ خاک جہان مجبور، سے پیدا ہوا ہے لیکن وہ مجبور محض نہیں رہا گو اس کے معنی یہ بھی نہیں کہ وہ بالکل آزاد اور خود مختار ہو چکا ہے۔ انسان کی لامحدود امکانی قوتوں پر اصرار کرنے کے باوجود اقبال نے اس کا اعتراف کیا ہے کہ انسان مکمل طور پر آزاد نہیں ہے۔ اس کی کچھ مجبوریاں اور معذوریاں بھی ہیں۔

اس نظریے میں یقیناً کوئی ندرت نہیں کہ انسان بیک وقت مختار بھی ہے اور مجبور بھی۔ لیکن جبر و قدر کے ابدی موضوع پر اقبال نے جس خیال کا اضافہ کیا ہے وہ غالباً یہ ہے کہ انسان کی مجبوری اور مختاری کے حدود معین اور مستقل نہیں ہیں۔ انسان اپنی آزادی کے علاقے کو وسیع تر کرنے اور اپنی نارسائیوں کے دائرے کو مختصر کرنے کی قدرت کا مالک ہے۔ مسلسل جد و جہد اور تخلیقی عمل کے ذریعے وہ اپنی بے طاقتی کو طاقتوری میں اپنی غلامی کو آزادی میں اور اپنے جبر کو اختیار میں تبدیل کر سکتا ہے۔ وہ اپنی ذات پر بھی قابو پا سکتا ہے اور اس دنیا پر بھی جس میں وہ رہتا ہے۔ وہ فطرت کو مسخر کر سکتا ہے جو اس کے لئے ہمیشہ ایک چیلنج رہی ہے۔ انسانی

ارتقا کی تاریخ انسان سے متعلق ان تمام خیالات کی تصدیق کرتی ہے۔ زمان و مکان پر انسان کی بڑھتی ہوئی فتوحات نے اس کے اختیارات میں اتنے زبردست اضافے کئے ہیں کہ ان پر خود انسانی عقل حیران ہے۔

فطرت پر انسان کی حکمرانی اقبال کو اس نظریے کی تجدید پر مائل کرتی ہے کہ انسان کائنات کا مرکزی نقطہ ہے ؎

نہ تو زمیں کے لئے ہے نہ آسماں کے لئے
جہاں ہے تیرے لئے تو نہیں جہاں کے لئے

اقبال کی شاعری میں انسان دنیا کا نہ صرف مرکز اور اس کا حکمران ہے بلکہ وہ کائنات کی تخلیق، تہذیب اور تکمیل میں خدا کا معاون بھی ہے۔ خدا کا معاون ہونے کے علاوہ وہ اس کا بہترین نقاد بھی ہے۔

انسان کو خدا کا معاون خالق قرار دے کر اقبال نے خدا اور انسان کے درمیان ایک نیا رشتہ دریافت کیا ہے اس سے پہلے خدا اور انسان کے درمیان خالق اور مخلوق، حاکم اور محکوم، عابد اور معبود، حامد اور محمود کا رشتہ رہا ہے۔

غالباً اقبال پہلے شاعر ہیں جنہوں نے انسان کو یہ محسوس کرنے میں مدد دی ہے کہ خدا اور انسان کے درمیان بہت سے رشتوں میں سے ایک رشتہ یہ بھی ہے کہ خدا خالق ہے اور انسان معاون خالق خدا یقیناً خالق اعظم ہے لیکن اس کی تخلیقات کی تکمیل بسا اوقات یا بہت سے معاملات میں انسان کی تخلیقی صلاحیتوں پر منحصر ہوتی ہے۔ انسان کی تخلیقات خدا کی تخلیقات کے تتمے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اقبال کی ایک مختصر لیکن نہایت خوبصورت نظم ہے محاورہ مابین خدا و انسان، اس میں خدا انسان کو الزام دیتے ہوئے کہتا ہے ؎

جہاں را زیک آب و گل آفریدم | تو ایران و تاتار و زنگ آفریدی
من از خاک پولاد ناب آفریدم | تو شمشیر و تیر و تفنگ آفریدی

تبر آفریدی نہال چمن را
قفس ساختی طائر نغمہ زن را

ان الزامات کی تردید کرتے ہوئے انسان کہتا ہے ؎

تو شب آفریدی چراغ آفریدم | سفال آفریدی ایاغ آفریدم
بیابان و کہسار و راغ آفریدی | خیابان و گلزار و باغ آفریدم

من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم
من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

اس نظم کے پہلے بند میں خدا اس بات کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ انسان کے تخلیقی کارنامے تخریبی ہیں۔ لیکن دوسرے بند میں انسان اس حقیقت پر اصرار کرتا نظر آتا ہے کہ اس کے تخلیقی کارنامے نہ صرف یہ کہ تعمیری ہیں بلکہ بعض لحاظ سے خدا کی تخلیقات کے ہم پلہ ہیں۔

جہاں تک انسانی عظمت کا تعلق ہے اقبال صرف اس اعلان پر قناعت نہیں کرتے کہ دنیا کے تخلیقی عمل میں انسان خدا کا معاون ہے بلکہ وہ اس بات پر بھی زور دیتے نظر آتے ہیں کہ جہاں خدا سب سے بڑا فن کار ہے وہاں انسان اس فن کار کا سب سے بڑا نقاد ہے ؎

مجھ کو پیدا کر کے اپنا نکتہ چیں پیدا کیا
نقش ہوں اپنے مصور سے گلہ رکھتا ہوں میں

گفت یزداں کہ چنیں است و دگر ہیچ مگو
گفت آدم کہ چنیں است و چناں می بایست

طرح نو افگن کہ ما جدت پسند افتادہ ایم
ایں چہ حیرت خانۂ امروز و فردا ساختی

یہ انسان کی جدت پسندی ہی ہے جس نے اسے باقی مظاہر فطرت پر برتری عطا کی ہے ؎

فروغ آدم خاکی ز تازہ کاری ہاست
مہ و ستارہ کنند آنچہ پیش ازیں کردند

اوپر جو کچھ لکھا گیا اس سے محفوظ طور پہ یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ انسان کی بنیادی اہمیت اور لاینفک عظمت

پر اقبال کا عقیدہ اپنے پیچھے نہ صرف ایک منطق رکھتا ہے بلکہ اس کی تصدیق نوع انسان کی پوری تاریخ سے ہو رہی ہے۔ انسان کی تحلیل کے ذریعے اقبال نے انسانیت کی ایک بڑی خدمت انجام دی ہے انہوں نے انسان کے وقار کو بحال کر دیا ہے جو ملدرجہ تقویت بخش بات ہے۔

اقبال نے انسان کی مصوری اس طرح کی ہے کہ اس میں اس کی عظمت کے بہت سے پہلو آگئے ہیں۔ انہوں نے اسے تلقین کی ہے کہ وہ اپنی نارسائیوں پر غالب آئے، اپنے اندر دل و دماغ کی بہترین صفات پیدا کرے، اپنی عقل اور اپنے وجدان کو مساوی تناسب کے ساتھ ترقی کرنے دے۔ اپنی ذات میں نمی اور گرمی دونوں کو جمع ہونے دے اور اس نقطۂ کمال تک پہنچے جس میں جمال و جلال دونوں شامل ہوں۔ شکست خوردگی اور قنوطیت کے اثرات سے انسان کو آزاد کرنے میں اقبال نے اپنی ساری ذہنی اور شاعرانہ قوتیں صرف کر دی ہیں۔

عظیم فلسفی پیسکل نے انسان کی عظمت اور اس کے مصائب کا ذکر کیا ہے۔ اقبال انسانی عظمت کے تصور میں اس قدر محو نظر آتے ہیں کہ وہ اس کے مصائب کا خاطر خواہ جائزہ نہ لے سکے۔ ان کی ابتدائی شاعری میں انسان کے کائناتی کرب کا احساس جھلکتا ہے اور یہ محسوس ہوتا ہے کہ انسان ایک غیر ہمدرد کائنات میں ڈال دیا گیا ہے جہاں وہ ایسی تنہائی اور غم کا شکار ہے جس میں مظاہر فطرت بالکل شریک نہیں۔ اقبال نے انسان کی کائناتی تنہائی اور بیچارگی کو اس قدر شدت کے ساتھ محسوس کیا کہ وہ یہ سوچے بغیر نہ رہ سکے کہ خدا کی لذتِ ایجاد انسان پر کرم ہے یا کہ ستم؟

این کوہ و صحرا این دشت و دریا
نے رازداراں نے غم گساراں

یہ مشت خاک، یہ صرصر، یہ وسعت افلاک
کرم ہے یا کہ ستم تیری لذت ایجاد

لیکن انسانی کرب کے اس شعور کو اقبال کے مرکزی فلسفۂ خودی و بیخودی کے ارتقا نے ماند کر دیا۔ انسانی

مصائب کے بجائے انسانی امکانات کا شاعر بننا اقبال کا عزم یا مقصد تھا۔ انہوں نے انسان کا مطالعہ زندگی کے سنگین حقائق اور المیوں کی بجائے نصب العین اور اقدار کی روشنی میں کیا۔ وجودیت کے ایک اسکول کی طرح اقبال نے یہ کبھی محسوس نہیں کیا کہ انسان ایک انسان دشمن کائنات میں پھینک دیا گیا ہے البتہ انہوں نے یہ ضرور محسوس کیا کہ جس دنیا میں انسان رہتا ہے اسے اپنی آرزوؤں کے مطابق بنانے کے لئے بہت کچھ کرنا ہے۔ اسی لئے انسان کے نام ان کا ایک اہم ترین پیغام یہ ہے ؎

بے ذوق نہیں اگرچہ فطرت
جو اس سے نہ ہو سکا وہ تو کر